استحکام پاکستان اور اسلامی نظریہ

پاکستان کی تاسیس کے ۷۵ برس پورے ہونے پر، ہم یہاں اُس قلمی مذاکرے سے چند حصّے پیش کر رہے ہیں، جسے ماہ نامہ چراغ راہ، کراچی نے ۱۹۶۱ء کے 'نظریۂ پاکستان نمبر' میں شائع کیا تھا۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ۶۲ برس گزر جانے کے بعد آج تک ہم اسی دوراہے پر کھڑے ہیں۔ بدقسمتی سے قومی، سیاسی، عسکری، انتظامی، صحافتی اور تعلیمی قیادت نہ بنیادی مسئلے کو سمجھنا چاہتی ہے اور نہ ٹھیک کرنا چاہتی ہے۔ جس کے نتیجے میں ہم رفتہ رفتہ ایک پاکستانی قوم سے ہٹ کر تنگ نظر قومیتوں کی طرف بڑھنے، مفادات کے گرداب میں پھنسنے اور وقتی و عارضی اہداف کے پیچھے بھاگنے والی قوم کا ثبوت دینے پر مُصر ہیں۔ مذاکرے کے تین محترم شرکا: ● سیّدابوالاعلیٰ مودودی ● ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ● جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کے جوابات یہاں دیئے جارہے ہیں۔ (پروفیسر خورشید احمد)

سوالات

۱ آپ کی نگاہ میں پاکستان کے بقا اور استحکام کے لیے اسلامی نظریے کی ضرورت اور اہمیت کیا ہے؟

۲ اسلامی نظریے کی طرف بڑھنے میں کون سی قوتیں مزاحمت کر رہی ہیں؟

۳ آپ کے خیال میں گذشتہ برسوں میں پاکستان، اسلامی نظریے سے قریب آیا ہے یا اس سے دور ہٹا ہے؟

۴ آپ کے نزدیک اسلامی نظریے کو عملاً بروے کار لانے کے لیے کون سے اقدامات ضروری ہیں؟ سیاسی اور تہذیبی زندگی پر اس نظریے کے کیا اثرات مرتب ہونے چاہییں؟

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی°

[ا] پاکستان کے بقا و استحکام کے لیے اسلامی نظریے کی اوّلین ضرورت و اہمیت یہ ہے کہ ہم مسلمان ہیں۔ اگر ایک مسلمان قوم کا نظریہ اسلامی نہ ہوتو اور کیا ہوسکتا ہے۔ مسلمان ہونے کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ: ہمارے خیالات اسلامی ہوں، ہمارے سوچنے کا انداز اسلامی ہو، معاملات پر ہم اسلامی نقطۂ نظر ہی سے نگاہ ڈالیں اور اپنی تہذیب، تمدن، سیاست، معیشت اور فی الجملہ اپنے پورے نظامِ زندگی کو اسلام کے طریقے پر چلائیں۔ اگر ہم ایسا نہ کریں تو آخر کس بنا پر ہم اپنے آپ کو مسلمان کہنے کے حق دار ہو سکتے ہیں؟ مسلمان ہونے کا دعویٰ بھی کرنا اور پھر اپنی زندگی کے مختلف گوشوں میں کسی غیر اسلامی نظریے پر کام بھی کرنا، لازماً یہ معنی رکھتا ہے کہ یا تو ہم منافق ہیں اور دل سے مسلمان نہیں ہیں، یا پھر ہم جاہل ہیں اور اتنا شعور بھی نہیں رکھتے کہ مسلمان ہونے کے کم سے کم منطقی تقاضے کیا ہیں؟

دوسری چیز اس سلسلے میں یہ ہے کہ ہم نے متحدہ ہندستان میں سے 'پاکستان' کے نام کا ایک الگ خطہ زمین کاٹ کر حاصل کرنے کے لیے جو لڑائی لڑی تھی، وہ تمام دنیا کے سامنے ڈنکے کی چوٹ یہ کہہ کر لڑی تھی کہ: ہم ایک جداگانہ تہذیب و تمدن رکھنے والی قوم ہیں۔ متحدہ ہندستان میں غیرمسلم اکثریت کے ساتھ ایک مشترک نظامِ زندگی ہم نہیں بنا سکتے۔ ہمیں اپنے نظامِ زندگی کے مطابق کام کرنے کے لیے ایک الگ علاقہ چاہیے، جہاں ہم اپنی تہذیب اور اپنے تمدن اور اپنے قوانینِ حیات کے مطابق کام کرسکیں ___ اب ایک سخت لڑائی لڑنے کے بعد جب وہ پاکستان ہمیں حاصل ہوگیا، جس کے لیے ہم نے یہ سارے پاپڑ بیلے تھے، تو یہ ایک بالکل عجیب حرکت ہوگی کہ ہم یہاں اسی تہذیب و تمدن اور نظامِ زندگی سے منہ موڑ لیں، جس کا ہم نے نام لیا تھا اور وہی سب کچھ کرنا شروع کر دیں جو متحدہ ہندستان میں بھی بآسانی کیا جاسکتا تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم تمام دنیا کے سامنے اپنے آپ کو ایک جھوٹی اور مکار، یا احمق اور بوالفضول قسم کی قوم کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ آخر دنیا یہ نہ سوچے گی کہ یہ عجیب قوم ہے کہ جس مقصد کا نام لے کر یہ لڑی تھی،

° سیّد ابوالاعلیٰ مودودی (م: ۲۲ ستمبر ۱۹۷۹ء)، داعی تحریک اسلامی

لڑائی میں کامیاب ہو کر اسی مقصد کو فراموش کر بیٹھی اور جو کام یہ لڑے بغیر کر سکتی تھی، وہی اس نے جان و مال اور آبرو کے بے شمار نقصانات اٹھانے کے بعد کرنا شروع کر دیا۔ ہماری سوسائٹی میں جن باتوں پر بے چارے سکھوں کا مذاق اڑایا جاتا ہے، ہماری یہ حرکت ان سے بدرجہا زیادہ بڑھی ہوئی ہوگی اور دنیا کے سامنے ہم اپنے آپ کو مہاسکھ کی حیثیت سے پیش کریں گے۔

تیسری چیز اس سلسلے میں یہ ہے کہ پاکستان مختلف عناصر سے مرکب ہے، اور جن عناصر سے یہ مرکب ہے اُن کے درمیان آج تک اپنی جداگانہ خصوصیات نمایاں طور پر موجود ہیں۔ ان کے اندر حقیقت میں کوئی امتزاج ایسا نہیں ہو سکا ہے، جو ان عناصر کو بالکل یک جان اور یک رنگ کر چکا ہو: ان کی زبانیں مختلف ہیں، لباس، عادات، طرز معاشرت مختلف ہے، نسلیں مختلف ہیں۔ ایک بڑی حد تک اُن کے مفاد بھی نہ صرف مختلف بلکہ متصادم ہیں۔ ان کے اندر جدا جدا ہونے کا احساس نہ صرف موجود ہے، بلکہ زندہ اور متحرک ہے، اور ایک ذرا سے اشارے پر بہ آسانی ابھر آتا ہے، اور سب سے زیادہ یہ کہ پاکستان جغرافی حیثیت سے ایک وطن بھی نہیں ہے۔ اس کے دو بڑے ٹکڑے، جن میں اس کی آبادی تقریباً نصف نصف بٹی ہوئی ہے [جب یہ جوابات لکھے گئے تب پاکستان، مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان (آج کل بنگلہ دیش) پر مشتمل تھا]، ایک دوسرے سے ہزار میل [ڈیڑھ ہزار کلومیٹر] کے فاصلے پر ہیں اور بیچ میں ایک ایسی طاقت حائل ہے جس کے ساتھ ہمارے کچھ بہت اچھے تعلقات بھی نہیں ہیں۔ کسی وقت بھی ان تعلقات کی خرابی کی وجہ سے ان دونوں ٹکڑوں میں مواصلات کے سارے رشتے کٹ سکتے ہیں۔ اس حالت میں پاکستان کو ایک وحدت بنا کر رکھنے والی قوت سوائے اسلام کے کوئی نہیں ہے۔ محض سیاسی نظام کی وحدت کوئی چیز نہیں۔ کیا اسی طرح کی وحدت آسٹریا اور ہنگری میں نہ تھی؟ کیا اسی طرح کی وحدت عثمانی سلطنت میں نہ تھی؟ اسی طرح کی وحدت برٹش ایمپائر [برطانوی سلطنت] میں نہ تھی؟ اس وحدت کے بل پر مختلف الجنس عناصر کو ایک 'بنیان مرصوص' نہیں بنایا جا سکتا۔ اس کے لیے زبان کی وحدت مددگار ہو سکتی ہے، مگر اس کا یہاں دور دور کوئی امکان نہیں۔ اس کے لیے معاشی مفاد کی وحدت بھی مددگار ہو سکتی ہے، لیکن ایک اندھا بھی دیکھ سکتا ہے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان یہ موجود نہیں ہے۔ اب سوائے ایک عقیدے اور دین کی وحدت اور اصول اخلاق و تہذیب کی وحدت کے اور کیا

ایسی چیز ہے جو پاکستان کے مختلف عناصر کو جوڑ کر رکھ سکتی ہو؟

چوتھی اور آخری چیز یہ ہے کہ ملک کی عظیم مسلم اکثریت، جو دراصل پاکستان کی بانی اور اس کی پشت پناہ ہے، سچے دل سے یہ ایمان رکھتی ہے کہ اس کی زندگی کے مسائل کا حل فی الواقع اسلامی نظام ہی میں ہے، اور اس نظام سے بہتر دوسرا نظام نہیں ہے۔ جن لوگوں کا اصلی عقیدہ یہ نہیں ہے، جو محض مسلمان گھرانوں میں پیدا ہو جانے کی وجہ سے مسلمان بنے ہوئے ہیں، مگر اپنے عقائد اور خیالات اور نظریات کے اعتبار سے غیر مسلم ہو چکے ہیں، ان کا معاملہ تو دوسرا ہے۔ وہ تو بلاشبہہ یہی چاہیں گے کہ ہم اپنے ساتھ بس مسلمان کا نام لگائے رکھیں، مگر کام کسی غیر اسلام نظریہ پر کریں۔ لیکن ایسے لوگ آخر ہماری آبادی میں ہیں کتنے؟ بمشکل ان کا تناسب ایک دو یا دس پانچ فی لاکھ ہوگا۔

آخر عقل و منطق، یا انصاف یا جمہوریت کے کس قاعدے سے اس چھوٹی سی اقلیت کو یہ حق پہنچتا ہے کہ یہاں کوئی نظام زندگی اس کے نظریات کے مطابق اختیار کیا جائے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ اس وقت یہی چھوٹی سی اقلیت ہمارے ہاں بڑے بڑے مناصب پر مسلط رہی ہے۔ لیکن یہ حالت خواہ کتنی ہی پریشان کن ہو، بہرحال اسے کوئی حقیقی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ اس لیے کہ ملک میں ایسی ایک اقلیت کے برسر اقتدار ہونے کی حیثیت ایک اجنبی قوم کے برسرِ اقتدار آنے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ انگریز بھی جب اس ملک پر حکومت کر رہا تھا تو اس کے کارفرماؤں اور کارپردازوں کی تعداد اس ملک میں اس سے زیادہ نہ تھی۔ اگر وہ اجنبی اقتدار یہاں مستحکم نہ ہو سکا تو یہ اجنبی اقتدار بھی یہاں مستحکم نہیں ہو سکتا۔

جب تک یہ اقتدار یہاں مسلط رہے گا، پاکستان کے باشندوں کی عظیم اکثریت کے جذبات، احساسات اور ان کی گہری جڑوں پر جمی ہوئی روایات سے اس چھوٹی سی اقلیت کے منصوبے پیہم متصادم ہوتے رہیں گے۔ تصادم کی وجہ سے یہ ملک ایک انچ بھی ترقی کے راستے پر آگے نہ بڑھ سکے گا، بلکہ جو کچھ پہلے کا بنا ہوا ہے وہ بھی بگڑتا چلا جائے گا۔ قوم کا دلی تعاون جس طرح بدیسی اجنبیوں کو کبھی حاصل نہ ہو سکا، اسی طرح ان دیسی اجنبیوں کو بھی کبھی حاصل نہ ہو سکے گا۔ ان کی حیثیت بالکل ایسی ہی رہے گی، جیسے کوئی شخص ایک ایسے گھوڑے پر سوار ہو، جو اسے سواری نہ دینا چاہتا ہو، اور سوار اور سواری میں مسلسل کش مکش جاری رہے۔ اس حالت میں کسی نظریے کے مطابق

بھی ہماری زندگی کے کسی مسئلے کا حل نہ ہو سکے گا، نہ اسلامی نظریے کے مطابق اور نہ غیر اسلامی نظریے کے مطابق۔ جو کچھ حکمران بنانا چاہیں گے قوم کا عدم تعاون اس کو نہ چلنے دے گا۔ جو کچھ قوم بنانا چاہے گی حکمرانوں کی جبری اور بعض حالات میں مسلح مزاحمت اس کو نہ چلنے دے گی۔ اس کش مکش کو کسی کا جی چاہے تو جب تک چاہے طول دیتا رہے۔ آخر کار پاکستان کی تعمیر کے لیے اگر کوئی کام ہو سکے گا تو اسی وقت ہو سکے گا، جب کہ قوم اور اس کے حکمرانوں کا مقصد اور مسلک ایک ہو، اور وہ اسلام اور صرف اسلام ہی ہو سکتا ہے۔

ایک اعتراض: اس تجزیے پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اگر اسلام نے مسلمانوں کو ایک نظام تمدن دیا ہے اور اس کی روایات ہماری قوم میں بڑی مضبوط ہیں تو پھر یہ کہنا کہاں تک درست ہوگا کہ پاکستان کے مختلف عناصر کی معاشرت اور ان کا مفاد ایک دوسرے سے مختلف بلکہ متصادم ہے؟

اس کے جواب میں مَیں کہوں گا کہ جہاں تک تمدن و معاشرت کے مختلف ہونے کا تعلق ہے اس کی وجہ تو بہ آسانی سمجھ میں آسکتی ہے، اگر ہم اس ملک میں مسلمانوں کی تاریخ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس ملک میں اسلام کو پوری طرح کام کرنے کا کبھی موقع نہیں ملا کہ وہ یہاں کے مسلمانوں کو مکمل طور پر ایک تہذیب و تمدن میں رنگ دیتا۔ اسلام کے ساتھ ساتھ دوسری تمدنی قوتیں بھی یہاں کارفرما رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم برعظیم ہندو پاکستان کے مسلمانوں کی زندگی کا تجزیہ کرتے ہیں، تو ہمیں صاف یہ نظر آتا ہے کہ ان کے اندر وحدت کے جتنے عناصر ہیں وہ تو سارے اسلام نے فراہم کیے ہیں، مثلاً: عقائد، اذان، نماز، روزہ، جمعہ اور عیدین، حج، ختنہ، نکاح و طلاق و وراثت کے قوانین، لباس میں ستر کے حدود، کھانے پینے میں حرام و حلال کے قیود، معاشرت میں پردہ، وغیرہ۔

اس کے برعکس ان کی زندگی میں اختلاف اور بیچ رنگی کے جتنے عناصر ہیں، وہ سارے کے سارے دوسری تمدنی قوتوں کے فراہم کردہ ہیں۔ اب اگر یہاں اسلام کو کام کرنے کا پورا موقع ملے اور نظامِ تعلیم و تربیت میں، قوانین میں، حکومت کی پالیسی میں اور دوسرے معاملات میں وہ پوری طرح یہاں کارفرما ہو تو وحدت پیدا کرنے والی طاقت زور پکڑتی جائے گی اور اختلاف پیدا کرنے والی طاقتیں کمزور ہوتی جائیں گی۔ لیکن اگر اس کے برعکس وحدت کا یہ واحد رشتہ تعلیم و تمدن،

قانون اور دوسرے مؤثر ادارات سے بے دخل رہے تو لامحالہ اختلاف پیدا کرنے والی طاقتیں زور پکڑتی جائیں گی اور ہماری آبادی کے مختلف عناصر کو بکھیر کر رکھ دیں گی۔

رہا معاشی مفاد کا مسئلہ، تو وہ قدرتی اسباب سے مختلف علاقوں میں رہنے والے لوگوں کے درمیان تصادم پیدا کرتا ہے۔ اگر اسلام کی رہنمائی میں ہم اپنے معاشی مسائل کو منصفانہ طریقے پر حل کر لیں اور اس کے ساتھ مسلمانوں کے اندر اعتقادی اور اخلاقی وحدت کو بھی بڑھائیں تو یہ تصادم روز بروز خفیف ہوتا جائے گا اور کبھی نازک صورت اختیار نہ کرنے پائے گا۔ لیکن بصورت دیگر اس کو کوئی طاقت روز بروز بڑھنے اور پاکستان کے مختلف حصوں کو باہم دست و گریبان کر دینے سے نہ روک سکے گی۔

ایک ضمنی سوال: اس سلسلے میں ضمناً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اسلامی نظریے کی یہی اہمیت ہے تو آخر دوسرے مسلم ممالک اس کو چھوڑ کر دیگر نظریات کیوں اختیار کر رہے ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ تمام مسلمانوں پر وہی ایک بلا مسلط ہے جو ہمارے اس ملک پر مسلط رہی ہے، یعنی کارفرمائی کی طاقتیں ہر جگہ ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں، جنھوں نے نہ کوئی اسلامی تعلیم و تربیت پائی ہے اور نہ اسلامی ذہنیت ان میں موجود ہے۔ قوم ہر جگہ مسلمان ہے، اسلامی جذبات رکھتی ہے اور اسلامی روایات اس میں گہری جڑوں کے ساتھ جمی ہوئی ہیں۔ لیکن سیاسی اور معاشی طاقت ہر جگہ ایک ایسی مختصر سی اقلیت کے ہاتھ میں ہے، جس نے یا تو براہِ راست مغربی استعمار کی گود میں پرورش پائی ہے یا مغربی استعمار سے چوٹ کھا کر اس کے آگے پوری طرح سپر ڈال دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جگہ [مسلم] قوم اور ان استعمار زادوں کے درمیان کش مکش برپا ہے، اور ہر جگہ مغربی نظامِ زندگی کا اجنبی پودا بالکل ایک دوسری سرزمین اور مخالف آب و ہوا میں لاکر زبردستی لگایا اور پروان چڑھایا جا رہا ہے۔

۲ ایک مزاحم طاقت کا تو میں اوپر ذکر کر چکا ہوں۔ اس کے علاوہ تین مزاحم طاقتیں اور قابلِ ذکر ہیں:

ایک، عام مسلمانوں کی جہالت اور اسلامی تربیت سے محرومی۔ ہم جب کبھی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ مسلمان ممالک میں اور اسی طرح پاکستان میں بھی مسلمان من حیث القوم اسلام

کے دلدادہ ہیں، تو اس سے ہماری مراد صرف یہ ہوتی ہے کہ ان کے جذبات و احساسات اسلامی ہیں، اور روایات کا گہرا اثر ان کو اسلام سے وابستہ رکھے ہوئے ہے۔ لیکن اس واقعہ سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور یہ بالکل ایک بدیہی حقیقت ہے کہ ان عام مسلمانوں کی عظیم اکثریت جس اسلام کی دلدادہ ہے، اس سے نہ تو یہ اچھی طرح واقف ہے اور نہ اس کے اصولوں کے مطابق اس کو اخلاقی تربیت ملی ہے۔ یہ ہماری بہت بڑی بدقسمتی ہے کہ مغربی استعمار کی آمد سے کئی صدیاں پہلے سے مسلمانوں کی حکومتیں اپنے بنیادی فرائض سے غافل رہیں، اور انھوں نے مسلم عوام کو اسلامی تعلیم و تربیت دینے کا فرض پوری طرح انجام نہیں دیا۔ اس کے بعد جب مغربی استعمار مختلف اسلامی ملکوں میں اور خود ہمارے ملک میں آیا تو اس نے ہمارے عقائد، اخلاق اور تہذیب و تمدن کی جڑیں ہلا ڈالیں، اور ہم پر ایک ایسا نظامِ تعلیم اور نظامِ سیاست و معیشت اور نظامِ قانون و تمدن مسلط کیا جو ہمارے فلسفۂ حیات اور نظامِ زندگی سے پوری طرح متصادم تھا۔

ان ساری چیزوں کے اثرات مسلمان قوموں میں ہر جگہ پائے جاتے ہیں اور اپنے ملک میں بھی ہم ان سے بری طرح متاثر ہیں۔ ہم یہ ضرور سمجھتے ہیں کہ اگر یہاں اسلامی نظامِ حکومت قائم ہو جائے تو عوام کے جذبات و احساسات ان شاء اللہ اس کا ساتھ دیں گے۔ لیکن ہمیں یہ غلط فہمی نہیں ہے کہ قوم کی جہالت و جاہلیت اس کے قائم ہونے اور چلنے میں مزاحم نہ ہوگی۔ لامحالہ، اسلام کے لیے کام کرنے والوں کو کافی مدت تک جان مار کر محنت کرنا ہوگی، تاکہ قوم کی بگڑی ہوئی عادات و خصائل کو درست کر کے اس نظام کے ساتھ ہم آہنگ کیا جائے، جسے وہ جذباتی طور پر دل سے پسند کرتی ہے۔ اس معاملے میں اصلاح کرنے والوں کو بڑی حکمت کے ساتھ ایک تدریجی پروگرام اختیار کرنا ہوگا۔ اگر حکمت اور تدریج کو وہ ملحوظ نہ رکھیں اور کسی وقت بھی اصلاح کی پوری خوراک [dose] بیک وقت دے ڈالنے کی کوشش کریں تو سارا کام بگاڑ کر رکھ دیں گے۔

دوسری مزاحم قوت ہمارے مذہبی طبقوں کا جمود ہے۔ ان لوگوں کو پوری طرح اس بات کا احساس و ادراک نہیں ہے کہ اسلام میں درحقیقت ثبات اور حرکت کے درمیان کس طرح توازن قائم کیا گیا ہے۔ کتاب و سنت کی رُو سے مستقل طور پر ثابت و قائم کیا چیزیں رہنی چاہییں اور حرکت کن پہلوؤں اور کن امور میں ہونی چاہیے، جس سے ہم زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ آگے

چل سکیں۔ ان کے نزدیک کلیات و اصول اور منصوص احکام سے لے کر استنباطی جزئیات و فروع تک ہر چیز اٹل ہے۔ اس جمود کی وجہ سے بھی بہت سی رکاوٹیں اب تک پیش آئی ہیں اور آگے بھی پیش آنے کا خطرہ ہے۔ اگر اصلاح کے لیے کام کرنے والے لوگ وہ ہوں جو قرآن و سنت اور فقہ اور اسلامی تاریخ پر اچھی نظر رکھتے ہوں، فرقہ بندی کے تعصّبات میں مبتلا نہ ہوں اور اپنے مزاج میں حکیمانہ اعتدال اور صبر و تحمل بھی رکھتے ہوں تو یہ مزاحمت تھوڑی یا بہت مشکلات کے باوجود رفع ہوسکتی ہے۔ ورنہ کم علم اور غیر معتدل لوگوں کے ہاتھوں یہ کام ہونے کی صورت میں سخت اندیشہ ہے کہ ہم اصلاح کرنے کے بجائے ملک میں مذہبی جھگڑے برپا کردیں گے۔

تیسری مزاحم طاقت ملک کے اندر نہیں بلکہ باہر ہے۔ ہمارے مغربی دوست، جن کے ساتھ ہم بہت سے مالی و معاشی و سیاسی رشتوں میں بندھے ہوئے ہیں اور جنھیں ہمارے آزاد ہو جانے کے باوجود ہماری قسمت پر اثر ڈالنے کے بہت سے مواقع حاصل ہیں۔ وہ خود چاہے کتنے ہی عیسائی ہوں اور عیسائیت پر فخر کریں اور کمیونزم کے مقابلے میں مذہب کے علَم بردار بنیں، مگر مسلمان قوموں کو وہ مسلمان نہیں دیکھنا چاہتے۔ میرا احساس یہ ہے کہ وہ اب تک کمیونزم کے مقابلے میں اسلام کو زیادہ خطرناک سمجھتے ہیں۔ ان کی خواہش یہ تو ضرور ہے کہ مسلمان قومیں مذہب کی بنیاد پر کمیونزم کی مخالف ہوں اور اس کے مقابلے میں ان کا ساتھ دیں۔ لیکن جب کبھی کسی ملک کو وہ اسلام کی طرف پلٹتے دیکھتے ہیں اور انھیں خطرہ ہوتا ہے کہ اب یہاں اسلام کا بول بالا ہونے والا ہے تو اپنی تمام جمہوریت نوازی کو چھوڑ کر اور اپنے تمام اصول، آئین و قانون کو نظر انداز کر کے وہ اس قوم کے اندر غیر آئینی انقلاب کی ہمت افزائی کرنے پر اُتر آتے ہیں، جمہوریت کے مقابلے میں ڈکٹیٹرشپ کی حمایت کرنے لگتے ہیں اور انتہائی وحشیانہ ظلم و ستم جو دینی رہنماؤں اور دینی کارکنوں پر کیا جائے، اس پر نعرہ ہائے تحسین و آفریں بلند کرتے ہیں۔ یہ تماشا ہم کئی برس سے مسلسل دیکھ رہے ہیں، اور ہمیں یہ یقین ہو چکا ہے کہ مسلم ممالک کے اندر اسلام کی نشاتِ ثانیہ کے راستے میں صرف اندرونی طاقتیں ہی مزاحم نہیں ہیں، بلکہ ان کی پشت پر یہ بیرونی طاقتیں بھی ہیں۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ ہماری جنگ آزادی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے، ہمیں آزادی کے لیے ابھی مزید لڑائی لڑنی ہے۔

پھر بدقسمتی سے اس وقت دنیا کی سب سے بڑی بین الاقوامی طاقت، یعنی امریکا پر ایک شیطان کا سایہ بھی ہے اور اس شیطان کا نام ہے ''یہود''۔ بین الاقوامی سازشیوں کے اس خطرناک گروہ کے ہاتھ میں بہت بڑی معاشی طاقت بھی ہے اور پریس کی طاقت بھی۔ خصوصیت کے ساتھ امریکا کی خارجہ سیاست پر اس کو جو تسلط حاصل ہے، اس نے تمام امریکیوں کو ان کی خواہش اور ارادے کے بغیر نہ صرف عربوں سے بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں سے زبردستی بھڑا دیا ہے۔ یہ یہودی حقیقت میں امریکا کے لیے انگریزی محاورہ کے مطابق evil genius، نفس امّارہ بنے ہوئے ہیں۔ جس مسلمان قوم کے اندر مذہبی احیا کے کچھ آثار نمودار ہوتے ہیں، یہ اس کے متعلق فوراً دنیا میں خطرے کی گھنٹی بجانے لگتے ہیں اور اس کی خبریں دنیا کو اس طرح سناتے ہیں جیسے دنیا میں کوئی بڑی آفت آنے والی ہے۔ اگر کسی مسلمان قوم میں الحاد اور بے دینی کا زور ہو رہا ہو تو یہ اس پر بغلیں بجاتے ہیں اور دنیا بھر کو خبر کر دیتے ہیں کہ وہ قوم بڑی 'ترقی' کر رہی ہے، بہت progressive [ترقی پسند] ہوگئی ہے۔ اگر کہیں کسی دینی تحریک کو کچلا جا رہا ہو، مقدمے چلائے بغیر لوگوں کو قید کیا جا رہا ہو، فوجی عدالتوں میں بالکل مضحکہ خیز طریقوں پر مقدمات چلا کر لوگوں کو پھانسیوں کی سزائیں دی جا رہی ہوں، تو یہ اس کی خبریں دنیا کو اس انداز سے دیتے ہیں گویا کوئی بہت بڑا نیک کام کیا جا رہا ہے، اور کوئی شرم ان کو ایسے افعال کی تحسین کرتے وقت لاحق نہیں ہوتی۔

اگر کسی مسلمان ملک میں جمہوریت کو بالائے طاق رکھ کر اور آئین و قانون کی مٹی پلید کر کے کوئی ڈکٹیٹرشپ قائم کر دی جائے تو یہ اس کا خیر مقدم کرتے ہیں، اور دنیا کو یقین دلاتے ہیں کہ مسلمان قومیں جمہوریت کے قابل ہی نہیں ہیں، ان کے لیے تو ڈکٹیٹرشپ ہی موزوں ہے۔ امریکا کے عام باشندے ذرا محسوس نہیں کرتے کہ اس طرح اپنی اغراض کے لیے یہودی سرمایہ دار اور یہودی پریس ان کو گواہ کر کے ایک خطرناک بین الاقوامی اُلجھن میں مبتلا کر رہا ہے۔ دنیا کے مسلمانوں کو اس سے کیا بحث کہ پس پردہ کون تار ہلا رہا ہے۔ وہ تو دیکھتے ہیں کہ عملاً یہی اس وقت امریکا کی پالیسی ہے اور یہودیوں کے زیر اثر اس کی سیاسی طاقت اسی پالیسی کے لیے استعمال ہو رہی ہے۔ اس کی وجہ سے امریکا کی وہ تمام مالی اور فنی امداد جو وہ مسلمان ملکوں کو دیتا ہے بجائے کوئی good will [اچھا تاثر] پیدا کرنے کے الٹا اثر مرتب کر رہی ہے۔

اس کی وجہ سے، مسلمان اس کے باوجود کہ کمیونزم کے مقابلے میں ان کا مفاد مغربی طاقتوں سے متحد ہے، اپنے اندر ان کی حمایت کے لیے کوئی جذبہ نہیں پاتے، بلکہ ان کے دلوں میں کمیونسٹ بلاک سے کچھ کم نفرت مغربی بلاک کے لیے نہیں ہے۔ مسلمان یہ سوچتے ہیں کہ ہم آخر کمیونسٹ بلاک کے مقابلے میں مغربی بلاک کا ساتھ کیوں دیں؟ اگر ہماری عزیز اور محبوب قدریں دونوں کے ہاتھوں سے یکساں طور پر پامال ہوتی ہیں تو ہمارے عمل میں ایک کے مقابلے میں دوسرے کے لیے ہمدردی پیدا ہونے کی کیا معقول وجہ ہے! ایک قوم کے خواص تو اپنے مخصوص مفادات کے لیے سب کچھ کر سکتے ہیں، لیکن ایک قوم کے عوام میں لڑنے کا جذبہ صرف اسی حالت میں ابھرتا ہے، جب کہ وہ اپنی عزیز و محبوب چیزوں کو خطرے میں دیکھتے ہیں، تو ان کو بچانے کے لیے اٹھنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ مسلمان عوام بہرحال مغربی بلاک کے لیے کرائے کے سپاہی [mercenaries] نہیں بن سکتے کہ محض مالی امداد لے کر وہ ان کی خاطر کمیونسٹ بلاک سے لڑیں۔ وہ اگر سچے جذبے کے ساتھ لڑ سکتے ہیں تو صرف دینی تہذیب، اپنے تمدن اور اپنے عقائد و نظریات کو بچانے کے لیے لڑ سکتے ہیں۔ لیکن اگر اسی چیز کو مغربی طاقتیں اپنی مداخلت یا ریشہ دوانیوں سے مسلمان ممالک میں پامال کرا دیں، تو پھر انھیں مسلمان قوموں سے کسی تائید کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ نوری السعید [م: ۱۹۵۸ء] اور چیانگ کائی شیک [م: ۱۹۷۵ء] کی قسم کے لوگ مختلف مسلمان ملکوں میں کھڑے کر کے وہ کچھ دنوں ان سے فائدہ اٹھاتے رہیں۔

بہرحال یہ تیسری مزاحمت مسلمان ممالک میں اسلام کا احیا چاہنے والوں کے لیے ایک بہت بڑا دردِ سر بنی ہوئی ہے، اور جس کو بھی اس مقصد کے لیے ان ملکوں میں کام کرنا ہو وہ اس کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔ اس کو اپنے حساب میں رکھ کر ہی اسے اپنا پروگرام بنانا ہوگا۔

۳ قریب بھی آیا ہے اور دُور بھی ہٹا ہے۔

قریب اس لحاظ سے آیا ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد سے اب تک اسلامی نظام کے حق میں مسلسل اتنا کام، اتنے وسیع پیمانے پر ہوا ہے کہ نہ اس سے پہلے اس ملک میں کبھی ہوا تھا اور نہ کسی دوسرے مسلمان ملک میں اس کی کوئی نظیر پائی جاتی ہے۔ اس کام کی وجہ سے ایک طرف علمی

حیثیت سے اسلامی نظام کے تمام گوشے اچھی طرح روشنی میں آ گئے ہیں، اور اب ساون کے چند اندھوں کو چھوڑ کر اس ملک کے ایمان دار اہل علم و اصحابِ فکر میں کوئی ایسا نہیں رہا ہے جو یہ کہہ سکتا ہو کہ 'اسلامی نظام' کوئی مبہم سا تخیل ہے جس کا نقشہ ہمارے سامنے واضح نہیں ہے۔ دوسری طرف عوام کے اندر اس مسئلے پر اتنی بیداری پیدا ہو چکی ہے اور اس کے حق میں ایسی مضبوط رائے عام تیار ہو گئی ہے کہ اب کسی میں یہ ہمت نہیں ہے کہ وہ کھل کر اس ملک میں لادینی نظام لانے کا ارادہ ظاہر کر سکے۔

اس کے علاوہ دو چیزیں اور بھی ہیں، جنھوں نے اسلامی نظریے کے لیے یہاں راہ ہموار کرنے میں بہت بڑا حصّہ لیا ہے: ایک یہ کہ بے شمار مذہبی اختلافات کے باوجود تمام اہلِ دین شروع سے اب تک اسلامی نظام کے مطالبے اور اس کی اصولی صورت کے بارے میں پوری طرح متفق رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ لادینی کے حامی مغربیت زدہ طبقے کے ہر عنصر کو پچھلے [تمام عرصے کے دوران] میں یہاں اپنا امتحان دینے کا پورا موقع مل چکا ہے اور انھوں نے اپنا ایسا برا حساب ساری قوم کے سامنے پیش کیا ہے کہ ان کی کوئی اخلاقی ساکھ اب باقی نہیں رہی ہے۔ حقیقتاً قوم اب ان سے پوری طرح مایوس ہو چکی ہے اور ان کے اندر اب کوئی عنصر ایسا نہیں رہ گیا ہے جس کو آزمایش کا موقع دینے کا کوئی سوال پیدا ہوتا ہو۔

دُور اس لحاظ سے ہوا ہے کہ [ان برسوں] میں برسرِاقتدار مغرب پرست طبقے کی مختلف تدبیروں سے اور اس کے بیرونی حامیوں کی مالی امداد اور ''قومی ترقی'' کے پروگراموں سے قوم کے اخلاق میں اتنا بگاڑ رونما ہو چکا ہے، جتنا آزادی سے پہلے غلامی کی پوری ڈیڑھ صدی میں بھی نہیں ہو سکا تھا۔ تعلیم و تربیت کا ناقص نظام نئی نسل کا ستیاناس کر چکا ہے اور کرتا چلا جا رہا ہے۔ 'ثقافت' کے نئے رنگ ڈھنگ اور اس کے ساتھ ریڈیو، سینما [ٹیلی ویژن] اور فحش لٹریچر، اونچے طبقوں سے لے کر دیہاتی عوام تک کو رنگیلا اور عیاش اور جرائم پیشہ بنانے میں شب و روز سرگرم ہیں، اور ان کی بدولت اخلاقی پستی کا زہر قوم کی رگ رگ میں اتر گیا ہے۔

اُونچے طبقوں کی بدترین مثالوں سے متاثر ہو کر عورتوں میں بے پردگی بڑھ رہی ہے۔ مرد و زن کے اختلاط میں اضافہ ہو رہا ہے۔ بے حیائی کے مظاہروں کا ایک سیلاب اُمڈا چلا آ رہا ہے، اور ان سب اسباب کے ساتھ مل جل کر 'ضبطِ ولادت' کی تحریک وہ خطرناک 'خدمت' انجام

دے رہی ہے، جو ہماری آبادی میں زنا اور اس کے قدرتی نتائج کو نقطۂ عروج پر پہنچا دے گی اور ہمارے عائلی نظام کی جڑیں ہلا ڈالے گی۔

پھر ہمارے سرکاری افسروں اور ملازموں میں، تاجروں اور صنعت کاروں میں اور دوسرے طبقات میں حرام خوری، خیانت، فرض ناشناسی اور آئین و قانون کی بے احترامی ایک وبا کی صورت اختیار کر چکی ہے، جسے روکنے کی ہر تدبیر، مرض میں مزید اضافے ہی کی موجب ثابت ہوئی ہے۔ یہ حالات، ظاہر ہے کہ اسلامی نظریے کے مطابق اصلاح کو روز بروز مشکل سے مشکل تر کرتے چلے جا رہے ہیں۔

۴ سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے وہ تو اس ملک میں جمہوریت کی بحالی ہے۔ اس لیے کہ اگر اس ملک کی حیثیت اس گھوڑے کی ہی ہو جس کے منہ میں لگام ڈال کر ہر طاقت ور شخص اس پر زبردستی سوار ہو جائے اور اسے اپنے راستے پر چلانا شروع کر دے، تو ایسی حالت میں گھوڑے غریب کے لیے یہ سوچنا ہی لا حاصل ہے کہ وہ کدھر جانا چاہتا ہے اور اپنی مرضی کے راستے پر جانے کے لیے اسے کیا کرنا چاہیے ـــــ ہمیں سب سے پہلے اس حالت کو بدلنا چاہیے۔

ہم کو یہاں ایک آزادانہ جمہوری ماحول درکار ہے جس میں اظہار خیال، اجتماع، تنظیم اور سعی و جہد کی آزادی ہو، جس میں ہر شخص اپنے خیالات کے مطابق رائے عام کو ہموار کرنے کی کوشش کر سکے۔ جس میں رائے عام کا کسی نظریے کے حق میں ہموار ہو جانا ہی اُس نظریے کے مطابق قیادت میں تبدیلی ہو جانے کے لیے کافی ہو، اور جس میں قیادت کی تبدیلی کے لیے ایک پُرامن آئینی راستہ موجود ہو۔ ایسے ماحول میں تو یہ ممکن ہے کہ میں اپنے نظریے کو بروئے کار لانے کے لیے کچھ اقدامات سوچ سکوں، انھیں بیان کر سکوں، لوگ ان کے صحیح یا غلط ہونے کے متعلق کوئی رائے قائم کر سکیں، اور جن کے نزدیک وہ صحیح ہوں وہ میرے ساتھ مل کر عملاً ان اقدامات کے لیے کوشش کر سکیں۔ لیکن اگر یہ ماحول موجود نہ ہو تو میرا اور آپ کا کسی قسم کے اقدامات کو سوچنا بے کار ہے۔ پھر تو سوچنا صرف ان لوگوں کا کام ہے جو گھوڑے پر سوار ہونے کی طاقت رکھتے ہوں۔

یہ لازمی اور ابتدائی شرط پوری ہونے کے بعد جو اقدامات اس نظریے کو بروئے کار لانے کے لیے درکار ہیں، وہ تین بڑے بڑے شعبوں پر مشتمل ہونے چاہییں، یا دوسرے الفاظ میں اس

مقصد کے لیے بیک وقت تین سمتوں میں متوازن طریقے سے کوشش کی جانی چاہیے:

- ایک، تبلیغ و تعلیم اور تعمیر فکر ـــــ اس سے میری مراد یہ ہے کہ ہم اپنے ملک کی آبادی کو وسیع اور عمیق پیمانے پر اسلام کے عقائد، اصول، احکام اور اخلاقی و عملی تقاضوں سے آگاہ کریں۔ غیر اسلامی نظریات و افکار اور نظام زندگی کے جو اثرات ان کے ذہن میں تھوڑے یا بہت اتر گئے ہیں ان کو صاف کریں۔ مختلف ذہنی طبقات کو ان کی استعداد کے مطابق یہ سمجھائیں کہ اسلام کے مطابق ہماری زندگی کے مختلف شعبوں کی تشکیل کس طرح ہونی چاہیے اور مختلف مسائل حیات کو کیسے حل کرنا چاہیے۔
- دوسرے، اصلاح اخلاق ـــــ یعنی لوگوں کی عملی زندگی کو اسلام کے تقاضوں کے مطابق درست کرنا اور ان غیر اسلامی اثرات کو عملاً ان کی زندگی سے خارج کرنا جو جہالت و جاہلیت کی وجہ سے یا قدیم غیر اسلامی تقالید کے باعث یا مغربی تہذیب و تمدن کی بدولت ان کے اندر پھیلے ہوئے ہیں۔
- تیسرے، نظام حکومت کی اصلاح ـــــ تاکہ حکومت کے ذرائع و وسائل اور اس کے قوانین اور اس کے انتظامی اختیارات اسلام کے مطابق ہماری زندگی کی تعمیر نو میں استعمال ہوسکیں، اور بالآخر ہم دنیا میں اس مشن کو پورا کرنے کے قابل ہوجائیں جو ایک امت مسلمہ ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے ہمارے سپرد کیا ہے۔
- ان تینوں شعبوں میں جس نوعیت کا کام درکار ہے، اس پر غور کرنے سے خود بخود آپ ایک چوتھی چیز کی ضرورت بھی محسوس کرلیں گے جس کے بغیر یہ کام نہیں ہوسکتا، اور وہ یہ ہے کہ ایک گروہ ہمارے اندر ایسا ہو جو اس کام کو انجام دینے کے لیے مخلص، صحیح الفکر اور صالح العمل کارکنوں پر مشتمل ہو۔ وہ منظم طریقے سے اس مقصد کے لیے سعی و جہد کرے، وہ خود اپنے کارکنوں کی اصلاح و تربیت کی طرف بھی متوجہ رہے اور کام کی وسعت کے ساتھ ساتھ مزید کارکن بھی پیدا کرتا رہے۔

سوال کا آخری حصّہ بڑی تفصیلی بحث چاہتا ہے جس کا یہاں موقع نہیں ہے۔ مختصر طور پر بس یہ سمجھ لیجیے کہ ہماری پوری قومی زندگی پر اس نظریے کے یہ اثرات مرتب ہونے چاہییں کہ ہم 'من حیث القوم' دنیا میں دین حق کے سچے نمائندے بن کر کھڑے ہوسکیں۔ آج تو یہ ہمارا محض دعویٰ ہی ہے کہ ہم ایک مسلمان قوم ہیں، ورنہ عملاً ہم اپنی زندگی کے ہر شعبے میں وہی سب کچھ کر رہے ہیں جو کوئی غیر مسلم قوم کرتی ہے، بلکہ ہماری کوشش یہ ہے کہ یورپ اور امریکا کے لوگ

ہمیں بالکل اپنے ہی جیسا پائیں اور ہم کو اپنی نقل مطابق اصل دیکھ کر داد دیں۔ لیکن اسلامی نظام زندگی کو شعوری طور پر اختیار کرنے کا نتیجہ لازماً یہ ہونا چاہیے کہ ہمارے اخلاق اور معاشرت میں، تہذیب وتمدن میں، ادب اور فنون میں، معیشت اور مالی معاملات میں، قانون اور عدالت میں، سیاست اور بین الاقوامی رویے میں، غرض ہماری ہر چیز میں اسلام کا اثر اتنا نمایاں ہو کہ کتابوں کو پڑھنے کے بجائے صرف ہمیں دیکھ کر ہی دنیا یہ جان لے کہ اسلام کیا ہے اور وہ انسان کو کیا کچھ بنانا چاہتا ہے۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی°

۱ میں سمجھتا ہوں کہ اسلام کے بغیر پاکستان ہرگز قائم نہیں رہ سکتا۔ اگرچہ میں اس کا قائل نہیں ہوں کہ پاکستان کی وحدت کا [واحد] سبب صرف اسلام ہے، بلکہ اس وحدت میں اور عناصر بھی شامل ہیں، لیکن ان میں سب سے زیادہ اہمیت اسلام کو حاصل ہے۔ اگر اسلام نہ ہو تو پاکستان کے شیرازے کو جمع رکھنا بہت دشوار ہو جائے گا۔

۲ میرا خیال یہ ہے کہ اس وقت سب سے زیادہ اہم قوت جو اسلامی نظریے کی طرف بڑھنے میں مزاحمت کر رہی ہے، اور صرف پاکستان میں ہی نہیں بلکہ تمام عالمِ اسلام میں کارفرما ہے وہ ایک ہی ہے، خواہ پاکستان ہو، عرب ممالک ہوں یا کوئی اور ملک، اصل مزاحم قوت مغربیت کا غلط تصور ہے۔ مغربی ممالک کی وہ خوبیاں جو اُن کی ترقی میں معاون ہیں، اسلام کی مزاحم نہیں ہیں۔ لیکن مغربی اثرات کی وجہ سے بعض غلط خیالات پیدا ہو گئے ہیں اور ہم نے ان غلط نظریات کو بھی تقلیداً بغیر کسی قسم کے غور وفکر کے اختیار کر لیا ہے۔ ہم میں ذہنی خود اعتمادی نہیں ہے، ایمان کی وہ قوت نہیں ہے جو ہمیں اچھے بُرے اور کھرے کھوٹے کو پرکھنے کے قابل بنائے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب ہم اپنے دین کی اقدار اور اُن کے تقاضوں سے واقف ہوں اور انھیں مقدم رکھیں، مؤخر نہ کر دیں۔

اس کے برعکس ہماری کیفیت یہ ہے کہ ہم اپنے ایمان کو بھی دوسروں کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ وہ کسوٹی سچی بھی ہے یا نہیں۔ اگر ہماری ذہنیت ٹھیک ہو جائے اور یہ

° پروفیسر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی (م: ۲۲ جنوری ۱۹۸۱ء) رکن پہلی دستور ساز اسمبلی پاکستان، سابق وائس چانسلر کراچی یونی ورسٹی اور تاریخ دان۔

ایک ذہنی انقلاب ہی سے ہوسکتی ہے۔ اگر ایسا ہوجائے تو پھر میرے خیال میں کوئی قوت ایسی نہیں جو ہمارے صحیح اسلامی رجحانات کو روک سکے اور اسلام کی طرف پیش قدمی کی راہ میں حائل ہوسکے۔ میرے ان الفاظ کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ ہم روشن خیالی یا ترقی کے تصورات سے دور ہوجائیں، لیکن بے سوچے سمجھے مغرب کی ہر معاملے میں تقلید کا نام ترقی یا روشن خیالی نہیں ہے۔ خصوصاً، جب کہ مغرب خود بعض غلط نظریوں اور عقیدوں کے مضر اثرات کے پنجے میں گرفتار ہے۔

[۳۳] اس کا فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے اور جو رائے بھی ظاہر کی جائے وہ ایک تعصب سے زیادہ نہیں ہوسکتی۔ اس لیے کہ میں اس بات کا قائل نہیں ہوں کہ بغیر کسی عملی جائزے اور سائنسی مطالعے کے، کسی عمرانی مسئلے کے بارے میں کوئی رائے قائم کی جائے۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ بعض چیزیں ایسی ہیں کہ جن میں یقیناً پاکستان اسلامی نظریے کے قریب آیا ہے اور بعض ایسی بھی ہیں جن میں پاکستان اسلامی نظریے سے دور ہوا ہے۔ لیکن ایک چیز ضرور ایسی ہے جس سے مجھے تشویش پیدا ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہمارے کالجوں اور اسکولوں کے طالب علموں میں اسلام کی طرف سے ایک بدذوقی پیدا ہورہی ہے۔ اس رجحان کی وسعت کا صحیح اندازہ تو نہیں لگا سکتا، تاہم میرا اندازہ صرف اس چیز پر قائم ہے کہ جن نوجوانوں سے میری ملاقات ہوتی ہے، ان سے گفتگو کے دوران مجھے یہ احساس پیدا ہوا کہ وہ اپنے دین کی طرف سے بدعقیدہ ہوتے جارہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی اصلاح اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک کہ ہمارے اساتذہ کے کردار میں اسلام کو دخل نہ ہو۔

اس بحرانی کیفیت کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ اسلام کی تعلیم کہیں بھی صحیح طریقے پر نہیں دی جارہی ہے۔ ہمارے تعلیمی ادارے موجودہ دور کے تقاضوں کو پورا نہیں کررہے ہیں اور ان کی تعلیم بڑی ناقص ہے۔ اسلام کی تعلیم محض دینیات کی چند کتابیں پڑھا دینے سے حاصل نہیں ہوتی، بلکہ دینیات تو ایک ایسی چیز ہے کہ اگر انسان میں صحیح ذوق ہو تو اس کی تعلیم وہ خود بھی حاصل کرسکتا ہے۔ اساتذہ اور تعلیمی اداروں کا اصل فرض یہ ہے کہ وہ طالب علموں میں صحیح دینی ذوق پیدا کریں اور ان میں ٹھیٹھ اسلامی ذہنیت اور اسلامی رجحانات کو ترقی دیں۔ فرائض کی تعلیم کا انتظام ضرور ہونا چاہیے، لیکن محض اسی پر قناعت کرلینا ہرگز درست نہیں۔ یہ تو اور بھی مناسب نہیں ہے کہ صرف فرائض کی

شد بد کو دینی تعلیم کا اہم ترین جز و تصور کر لیا جائے۔ زیادہ اہم چیز تو یہ ہے کہ طلبہ میں جوش ایمانی پیدا کیا جائے، ان کے اسلامی رجحانات کو مضبوط بنایا جائے اور اسلام کی خدمت اور تقاضوں کو پورا کرنے کا جذبہ اور ولولہ پیدا کیا جائے۔ اس قسم کی تعلیم ہماری ذہنیتوں کو بدل دے گی اور من حیث القوم ہم اسلام کی طرف تیز رفتاری سے بڑھنے لگیں گے۔

۴ کچھ عرصہ پیش تر مجھے ڈیوک یونی ورسٹی [درہام، شمالی کیرولینا، امریکا] نے ایک مذاکرے کے لیے بلایا تھا، جہاں پر مَیں نے ایک مقالہ اسی عنوان سے پیش کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا تھا: پاکستان میں آئین ناکام نہیں رہا ہے بلکہ آئین کو چلانے والے ناکام رہے ہیں، ہماری ناکام حکومتیں کردار کی خامی کے سبب سے صحیح نہ چل سکیں۔ ہمارے ہاں سب سے زیادہ کمی کردار کی تھی، اگر کردار درست ہوتا اور آئین ناقص بھی ہوتا تو ہم کردار کے زور پر اسے کامیاب بنا سکتے تھے۔ لیکن اگر آئین اچھا بھی ہو اور کردار ناقص ہو تو آئین کبھی نہیں چل سکتا، اس لیے کہ ہر آئین اور ہر حکومت کو چلانے والے بہرحال انسان ہوتے ہیں، اگر یہ انسان ایمان داری سے کام لیں اور صحیح طریقے پر کام کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ بڑی سے بڑی مشکلات پر قابو نہ پالیں۔

اگر ان میں ایمان داری کا، حب اسلام اور حب وطن کا سچا جذبہ نہ ہو، اگر وہ اپنی ذمہ داری کو محسوس نہ کریں تو پھر اچھے سے اچھا آئین بھی ناکام ہو کر رہ جائے گا اور ان کی کوئی مدد اور رہنمائی نہ کر سکے گا۔ آخر یہ کردار ہی تو ہے کہ ایک شخص مسجد میں جا کر نماز پڑھتا ہے اور اسی مسجد میں قدم رکھنے والا دوسرا فرد جوتیاں چراتا ہے۔ اب اس میں مسجد بے چاری کا کیا قصور؟ اگر کوئی شخص وہاں جا کر جوتیاں ہی چراتا ہے تو یہ کردار کی خرابی ہے، مسجد کی نہیں، مسجد کا اگر کچھ اثر ہے تو وہ نماز کی ترغیب دینے کی طرف ہے کسی اور سمت نہیں!

اس سوال کے آخری حصّے کے سلسلے میں میری گزارش یہ ہے کہ سب سے بنیادی چیز کردار ہے۔ کردار کے بغیر دنیا میں کوئی چیز کامیاب نہیں ہوسکتی۔ آپ غور کریں تو آپ محسوس کریں گے کہ اگر لوگوں میں اسلام ہوتا اور ان کے دل میں ایمان کا جذبہ ہوتا اور اگر وہ اپنی ذمہ داری کو سمجھتے، تو یہ ناممکن تھا کہ وہ تمام خرابیاں پیدا ہوتیں جو نہ صرف ہماری سیاست بلکہ ہماری زندگی کے ہر شعبہ میں پیدا ہوگئی ہیں۔ ہماری حکومت اصل میں ہماری قوم کے کردار کا آئینہ بھی تھی۔ ہماری زندگی

کے ہر شعبے میں خودغرضی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ ہم اپنی چھوٹی سے چھوٹی غرض کو پورا کرنے کے لیے بڑے سے بڑے اصول کو قربان کرنے کے لیے تیار ہیں۔

یہ بالکل ظاہر ہے کہ اگر ہمارے ہاں پچھلی حکومتیں ناکام رہیں تو وہ اسلام کی وجہ سے یا اسلامی اصولوں کی وجہ سے ناکام نہیں رہیں، بلکہ اس وجہ سے ناکام رہیں کہ انھوں نے اسلامی اصولوں کو پس پشت ڈال دیا۔ اسلام کی تعلیم یہ نہیں ہے کہ رشوت لو، اسلام کی تعلیم تو یہ ہے کہ رشوت نہ لو۔ اسلام یہ بتاتا ہے کہ انسان پر سب سے بڑا فریضہ جو عائد ہوتا ہے وہ حقوق العباد ہیں، مگر ہم نے حقوق العباد کو پس پشت ڈالا اور کسی مظلوم غریب کا کام ہم نے بغیر رشوت کے نہیں کیا۔ ہم نے فرائض کو فرائض نہ سمجھا۔ ہمارے دل سے اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی کا احساس ہی ختم ہوتا چلا گیا۔ جس قوم کے دل سے اللہ کا خوف چلا جائے اور جس کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہو جائے کہ اس نے تو صرف اسی دنیا کو بنانا ہے ـــــ دنیا بھی ایسی نہیں بنانی جس سے ساری قوم کو یا ملک کو فائدہ پہنچے بلکہ مقصود محض ذاتی منفعت ہو، ایسی قوم لازماً اپنے آپ کو تباہ کر لیتی ہے۔ وہ لوگ جو اپنی خودغرضیوں ہی کو اصول اور ایمان سمجھتے ہیں، وہ اپنے آپ کو بھی یقیناً تباہ کر لیتے ہیں اور اپنی قوم کو بھی۔ پھر اس سے بڑی کوئی غلط فہمی نہیں ہے کہ انسان یہ سمجھے کہ قوم تباہ ہوتی ہے تو ہو جائے اور وہ تو خوش حال رہے گا۔ ایسے خودغرض افراد، ملت کی قبر کھودتے ہیں اور اسلام کو ضعیف کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں جو خرابیاں پیدا ہوئی ہیں، وہ اسلامی اصول سے بالکل قطع تعلق کر لینے کی وجہ سے، محض اسلام کا نام زبان سے لینے اور اسے عمل کی دنیا میں کسی طرح داخل نہ ہونے دینے کی وجہ سے ہوئی ہیں۔

جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ اسلامی نظریے کو بروئے کار لانے کے لیے کون سا طریقہ اور کون سے اقدامات ضروری ہیں، تو انھیں مختصراً بیان کر دیتا ہوں:

ہمیں سب سے بڑی ضرورت عمل کی ہے۔ ہر شعبے میں اور ہر دائرہ زندگی میں محض زبانی جمع خرچ سے لوگوں پر اثر نہیں ہوتا۔ جب تک کہ وہ اچھا عمل نہ دیکھیں، وہ کسی چیز پر حقیقی اعتماد نہیں کرتے۔ بہترین عمل کی مثال پیش کیے بغیر عوام میں حرکت پیدا نہیں کی جاسکتی۔ آپ دیکھیے کہ اگر عمل کی ضرورت نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ، قرآن کو ایک کتاب کی شکل میں بھیج دیتا اور اس کتاب ہدایت کے ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسوۂ حسنہ بنا کر نہ بھیجتا۔ وہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا

اسوۂ حسنہ ہی تھا کہ جس نے لوگوں کو قرآن کی تعلیم کا گرویدہ کیا۔ اپنے متن اور الفاظ میں قرآن کریم اب بھی وہی ہے، لیکن ہمارے دلوں میں وہ اس وجہ سے گھر نہیں کرتا کہ ہم میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اس پر عمل کرتے ہوں، اور جو اچھا نمونہ لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہوں۔ اس لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ ہمارے رہنما، ہمارے تاجر، ہمارے اساتذہ، ہمارے والدین ـــــ اور وہ تمام افراد جو کسی نہ کسی دائرے میں زندگی کی رہنمائی کر رہے ہیں، اسلامی کردار کا بہترین نمونہ پیش کریں اور اپنے عمل سے قوم کی رہنمائی کریں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ملت کے کردار میں ایک انقلاب پیدا کیا جائے، اور اس انقلاب کو پیدا کرنے کے لیے لازم ہے کہ اسلام کو محض ایک عقیدے کے طور پر پیش نہ کیا جائے، بلکہ اس پر زور دیا جائے کہ اسلام ایک طریقۂ زندگی ہے جس کے بغیر فلاح ممکن نہیں ہے۔

ہم نے دیکھ لیا ہے کہ ہم نے اس دوران میں اسلامی کردار کو چھوڑا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم بالکل تباہی کے کنارے پر پہنچ گئے اور اگر اب ہمیں اس تباہی کے کنارے سے بچنا ہے تو ہمیں اپنے کردار کو درست کرنا پڑے گا، اور اس کے لیے استاد کو، والدین کو اور ہر شخص کو کمر بستہ ہونا پڑے گا۔ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث بھول گئے ہیں، کاش! ہمیں وہ آج یاد آئے۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

> تم سب راعی (یعنی حاکم، صاحب امر اور منتظم) ہو اور ہر ایک سے اس کی رعیت (یعنی وہ چیز جس پر تم کو اختیار دیا گیا ہے) کی بابت باز پرس ہوگی۔ حکمران راعی ہے اور اس سے اس کی رعیت کے حقوق ادا کرنے کی بابت پوچھا جائے گا۔ اور ہر مرد اپنے عیال میں راعی ہے اور اس سے اس کی رعیت کی بابت دریافت کیا جائے گا اور ہر عورت اپنے خاوند کے گھر کی منتظمہ ہے اور اس سے اس کے مفوضہ فرائض کی بابت پوچھا جائے گا اور خدمت گار اپنے آقا کے مال و اسباب کا نگران ہے اور اس سے اس کی بابت سوال کیا جائے گا۔ (بخاری و مسلم)

پس، ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ ہم میں سے ہر شخص امیر [منتظم] ہے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ۔ اپنے اپنے دائرے میں ہر ایک کو اپنے فرائض ادا کرنے چاہییں۔ ہر وہ شخص جس کے

ہاتھ میں کچھ اختیار ہے یا جو دوسروں پر اثر انداز ہوسکتا ہے، جس کے نمونے سے دوسرے لوگوں کے کردار بہتر ہو سکتے ہیں، اُسے چاہیے کہ وہ اپنے کردار کو درست کرے، یہی اسلام کا راستہ ہے۔

اگر پوری قوم اس طرف توجہ نہیں کرتی تو ہماری حکومت کا فرض ہے کہ صحیح کردار کو اسلام کی روشنی میں لوگوں کے سامنے پیش کر دے۔ ہمارے تعلیمی اداروں کا فرض ہے کہ اس بنیادی سبق کو ذہن نشین کرا دیں۔ سب سے زیادہ اُن سمجھ دار لوگوں کا فرض ہے کہ جو ان چیزوں کو سمجھتے ہیں۔ یہ فرض کہ وہ اپنے کردار سے اصول کی پابندی کا نمونہ قائم کریں۔ ممکن ہے کہ وہ یہ سمجھیں کہ اصول کی پابندی سے [مالی] نقصان پہنچتا ہے، لیکن ایسا سوچنا ایک خام خیالی ہے۔ اصول کی پابندی سے نقصان نہیں ہوتا بلکہ فائدہ ہی پہنچتا ہے۔ بدکرداری سے ذرا سی مدت کے لیے تھوڑا سا فائدہ پہنچ سکتا ہے، لیکن آخر میں اس کا نتیجہ نقصان ہی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو اصول ہماری رہنمائی کے لیے پیش کیے ہیں، انھی میں کامیابی کا راز مضمر ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

> اللہ تعالیٰ کوئی ایسا جابر بادشاہ نہیں ہے جو محض اپنے کو خوش کرنے کے لیے دوسروں سے اطاعت چاہتا ہے، وہ اطاعت اس لیے چاہتا ہے کہ اس کی اطاعت ہی میں لوگوں کا بھلا ہے۔ اس کی اطاعت میں افراد کا بھی بھلا ہے اور اس کی اطاعت میں قوموں کا بھی بھلا ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ)

اگر اس نقطۂ نظر کو ہم لوگوں کے سامنے پیش کریں، پورے استدلال سے پیش کریں، جوش و خروش سے پیش کریں، نرمی سے پیش کریں، غرض اُس طرح جس طرح سے پیش کرنا ممکن ہے تو کچھ عرصے میں ہماری حالت ان شاء اللہ درست ہوجائے گی۔

ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ کوئی دین بغیر تبلیغ کے قائم نہیں رہ سکتا۔ دین اسلام تو مسلسل تبلیغ ہی کا نام ہے۔ یہ تبلیغ صحیح ہونی چاہیے۔ بچپن ہی سے مسلمان بچوں کو اس مقصد کے لیے تیار کیا جانا چاہیے، خواہ وہ اپنے گھر کے اندر رہے یا اس کے باہر، چھوٹے دائرے میں کام کرے یا پوری انسانیت کے سامنے، اسی طرح ان لوگوں اور معاشروں میں اسلام زندہ رہ سکتا ہے اور ملت کو فائدہ پہنچا سکتا ہے۔

دوسری بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اسلام کی روح اور اسلام کی تعلیمات ایسی چیزیں ہیں

جو ہر زمانے اور ہر دور کے مسائل پر قابو پا سکتی ہیں، بشرطیکہ ان پر صحیح طریقے سے عمل ہو۔ ایک زمانہ ایسا تھا، جب انسانی زندگی میں اتنی پیچیدگی نہیں تھی جتنی موجودہ زمانے میں ہے۔

حضرت شاہ ولیؒ اللہ نے بجا طور پر یہ فرمایا ہے:

جتنا زمانہ گزرتا جاتا ہے معاشرت میں اتنی ہی پیچیدگی پیدا ہوتی جاتی ہے، اور جتنی معاشرت پیچیدہ ہوتی جاتی ہے، اسی قدر معاملات کو سلجھانے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ (ایضاً)

آج کی دنیا میں حکومت اور ریاست کا دائرہ عمل وسیع ہوتا چلا جاتا ہے اور اس کا حلقۂ اقتدار اور اس کے ذرائع و وسائل بھی وسیع ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ان حالات میں مَیں سمجھتا ہوں کہ حکومت کے وسائل کا اسلامی تعلیم کو فروغ دینے کے لیے استعمال ہونا بے حد ضروری ہے۔ جب تک ریاست کا دائرہ عمل مختصر تھا اور انسان کی زندگی پر اس کا اثر کم پڑتا تھا، اس صورت میں اگر ریاست گمراہ بھی ہوتی اور اس میں ضلالت بھی ہوتی تو اس کے باوجود لوگوں کی زندگی پر گہرا اثر نہیں پڑتا تھا۔ چھوٹی بستیاں اپنی زندگی کے پرانے طریقے پر قائم رہتی تھیں۔ ہم نے دیکھا کہ ہمارے ہاں انگریز کی حکومت آئی اور چلی گئی۔ اس کی وجہ سے اسلام کو سخت نقصان بھی پہنچا، لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کی کتنی ایسی چھوٹی چھوٹی آبادیاں تھیں جن کی دینی زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑا، اور وہ اپنی زندگی ویسے ہی گزارتی رہیں، جیسے پہلے گزارتی تھیں۔ مگر آج یہ بات ناممکن ہے۔ اس لیے بہت زیادہ ضروری ہے کہ ریاست کی بڑھتی ہوئی ذمہ داریوں میں اسلام کو دخل ہو۔

عقلی بنیاد پر بھی اگر آپ غور کریں تو یہ حقیقت صاف ظاہر ہے کہ حکومت کا لائحہ عمل اور دائرۂ کار جتنا بڑھتا جاتا ہے، اتنا ہی یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ اخلاقی قدریں حکومت کے پیش نظر رہیں، ورنہ حکومت کا وسیع تر اختیار ظلم و استبداد میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک صحیح اخلاقی اقدار اور نظریات وہی ہیں جو اسلام نے پیش کیے ہیں۔

اس کے ساتھ میں یہ بھی عرض کر دوں کہ اسلام کے دو پہلو ہیں: ایک انفرادی، دوسرا اجتماعی۔ جہاں تک انفرادی پہلو کا سوال ہے، اس کا تعلق میری اپنی ذات یا میرے اللہ سے ہے اور اس میں کسی دوسرے شخص کا کوئی دخل نہیں۔ لیکن دوسرا پہلو وہ ہے جو میرے ان تعلقات پر حاوی ہے جو میرے اور دوسرے مسلمانوں کے، تمام انسانوں کے، زندگی کی تمام وسعتوں کے

درمیان قائم ہیں۔ ان تمام تعلقات کو درست کرنا اسلام کا اولین مشن ہے۔ اسلام محض بندے اور اللہ کے درمیان تعلق کا نام نہیں ہے۔ وہ ایک اجتماعی نظریہ بھی ہے، بلکہ اس کا اصل کام ہی خاص دائرے میں ہے۔ اسی لیے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ ''اسلام میں رہبانیت نہیں ہے''۔ اسی وجہ سے ہمیں اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ ہم ان تعلقات کو جو ہمارے اور دوسرے افراد کے درمیان ہیں، نظرانداز کردیں۔ ہمارے لیے لازم ہے کہ ہم ان تعلقات کو صحیح بنیادوں پر استوار کریں، اور اگر ہم مسلمان ہیں تو ہمارے کارفرما اصول وہی ہوسکتے ہیں جو اسلام نے مقرر کیے ہیں۔

یاد رکھیے کہ اسلام کے اصولوں میں بہت گنجایش ہے اور وسعت بھی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ معاشی تعلقات کے لیے جو نظریات کچھ عرصہ قبل قائم ہوئے تھے، ان میں کسی توسیع کی یا تبدیلی کی ضرورت یا گنجایش نہیں ہے۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ اسلام کو موجودہ دور کے حالات کے مطابق سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان سب کی ضرورت ہے، لیکن اس کام کے لیے سچے ایمان اور صحیح فہم کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ جو ہماری روایات ہیں، اُنھیں ہم ناکارہ سمجھ کر اور بغیر یہ دیکھے ہوئے کہ ان میں کیا خوبی ہے، پس پشت نہ ڈال دیں۔ اس لیے کہ اس سے زیادہ حماقت اور کیا ہوگی کہ تیرہ سو سال کی جو پونجی ہمارے پاس موجود ہے اسے ہم بغیر سوچے سمجھے پھینک دیں۔ یہ ضرور ہے کہ ہمیں اس کے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ بعض جگہ اس پر نظرثانی کی بھی ضرورت ہے۔ یہ تمام کام ایمان داری، اخلاص اور فہم کے ساتھ ہوسکتے ہیں، اندھی نقالی کے ساتھ نہیں۔

جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال°

[1] پاکستان کو اپنی بقا اور استحکام کے لیے اسلامی نظریے کی اہمیت اور ضرورت اس لیے ہے کہ اس ملک میں مختلف قومیں آباد ہیں، جو مختلف زبانیں بولتی ہیں اور جو جغرافیائی طور پر ایک دوسری کے متصل نہیں۔ اُن میں اگر کوئی جذبہ مشترک ہے تو فقط اسلامی جذبہ ہے۔ اگر اس جذبے کو

° جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال (م: ۳/اکتوبر ۲۰۱۵ء) علامہ اقبال کے فرزند، سپریم کورٹ آف پاکستان کے سابق جج اور سینیٹ آف پاکستان کے ممبر

مٹا دیا جائے تو پاکستان بھی صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گا۔

۲ اسلامی نظریے کی طرف بڑھنے کی راہ میں جو قوتیں مزاحمت کر رہی ہیں، اُن میں سب سے بڑی قوت 'خوف' ہے۔ ہم بحیثیت مجموعی ایک 'خوف زدہ' قوم ہیں۔

۳ گذشتہ برسوں میں پاکستان اسلامی نظریے سے قریب نہیں بلکہ دور ہٹا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ منافقت ہماری قومی خصوصیت بن چکی ہے۔

پاکستان کے دستور اس لحاظ سے ناکام رہے کہ یہ بدقسمت قوم صحیح رہنما پیدا کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ اس قوم میں صحیح رہنما خال خال پیدا ہوتے ہیں۔ اس دوران میں جو سیاسی رہنما ملکی سیاست کے میدان میں آئے ہیں، اُن میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو قوم کی قیادت کے اہل نہ تھے، جن کا کوئی اصول نہ تھا، جو محض ذاتی طاقت کے حصول کے درپے تھے، جن کا قوم سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا، جو قوم کی ضرورت کو نہ سمجھتے تھے اور جو منافق تھے۔ اگر کسی قوم کا دستور 'منافقت' کے اصولوں پر قائم کیا جائے تو وہ دیر پا ثابت نہیں ہوسکتا۔

۴ اسلامی نظریے کو عملاً بروئے کار لانے کے لیے ذہنیتوں میں انقلاب کی ضرورت ہے۔ اگر مستقبل قریب میں ایسا انقلاب وجود میں آ جائے تو اس ملک کی سیاسی اور تمدنی زندگی کی ارتقا کے امکانات پیدا ہو جائیں گے اور اگر نہیں تو ہمارا مستقبل تاریک ہے۔